

## تفسیر "سورہ البقرة" (آیات 21 تا 25)

<"xml encoding="UTF-8?>

"يَا يَهَا النَّاسُ اعْبُدُوا رَبَّكُمُ الِّذِي خَلَقَكُمْ وَالَّذِينَ مِنْ قَبْلِكُمْ لَعَلَّكُمْ تَتَّقُونَ (21)

اے انسانو! عبادت کرو اپنے پروردگار کی جس نے تمہیں بھی پیدا کیا اور انہیں بھی جو تمہارے پہلے تھے عجیب نہیں کہ تم اپنے بچاؤ کا سامان کرسکو"

؛؛

مخصوص طریق عبادت جیسے روزہ وغیرہ کا جہاں قرآن میں حکم دیا ہے وہاں "یا يَهَا الذِينَ أَمْنَوْا" کہہ کر پکارا ہے اس لیے کہ جنہوں نے اصل رسالت و شریعت کو تسلیم ہی نہیں ان سے جزئیات احکام اور طریق عبادت کے بنائے کا کوئی محل نہیں۔ مگر مطلق عبادت یعنی خدا کی بارگاہ میں احساس بندگی کی پیش کش کی طرف توجہ دلائی جا رہی ہے یہاں "یا يَهَا النَّاسُ" کہہ کر مخاطب کیا جا رہا ہے اس لیے کہ خالق کی عبودیت کا جب احساس پیدا ہوگا اسی وقت تو وہ رسول صلی اللہ علیہ والہ وسلم کی دعوت پر لبیک کہنے اور کم از کم اس پیام پر غور کرنے کی ضرورت محسوس کریں گے۔ اور اسی لیے یہ احساس عبودیت جس کی دعوت دی گئی ہے اس کا نتیجہ بتایا ہے "لعلکم تتقوون": "انتقاء" کے معانی ہیں کسی خطرہ سے بچنے کا سامان کرنا۔ چونکہ خالق کی طرف ذہن کی توجہ ہونے کے ساتھ انسان کو یہ فکر ہونی چاہیئے کہ اس کے مجھ پر کچھ حقوق ہیں اور اُن حقوق کے ادا نہ کرنے سے میں مستحق سزا ہوں گا۔ اسی سے خطرہ کا احساس پیدا ہوتا ہے اور اسی خطرہ سے تحفظ کے لیے اس کی طرف سے رسالت کا ادعاء رکھنے والے کی باتوں پر کان لگانے اور انکی سچائی پر غور کرنے کی ضرورت پیدا ہوتی ہے جس پر آئندہ کے تمام ذرائع نجات کا انحصار ہے۔

\*\*

"الَّذِي جَعَلَ لَكُمُ الْأَرْضَ فِرَاشًا وَالسَّمَاءَ بِنَاءً وَأَنْزَلَ مِنَ السَّمَاءِ مَاءً فَأَخْرَجَ بِهِ مِنَ الثَّمَرَاتِ رِزْقًا لَكُمْ فَلَا تَجْعَلُوا لِلَّهِ أَنْدَادًا وَأَنْثُمْ تَعْلَمُونَ (22)

جس نے تمہارے لیے زمین کو بچھوئنا اور آسمان کو چھت بنایا اور اوپر سے پانی برسایا تو اس سے پہلوں کے قبیل سے

تمہاری غذا برآمد کی۔ اب اس کے بعد جان بوجہ کر اللہ کے لیے برابردار نہ بناؤ"

؛؛

قرآن مجید میں زمین آسمان اور دیگر کائناتِ عالم جو ذکر ہے وہ اس مقصد کے لیے نہیں ہے کہ انکی حقیقتوں اور ماہیتوں کو بیان کیا جائے بلکہ ایک تو ان کے افادی پہلوؤں کو جو بنی آدم سے متعلق ہیں نمایاں کر کے اللہ کی نعمتوں کا احساس کرانا منظور ہے اور دوسرے انکی عظمت اور حیرت انگیز خلقت کی طرف توجہ دلاکر خالق کی عظمت و قدرت کی طرف توجہ دلانا مطلوب ہے۔ زمین چاہے گُروی ہو اور چاہے مسطح بہرحال جہاں تک ہمارے لیے کارآمد اور محسوس پہلو کا تعلق ہے وہ ایک بچھوئے ہی کی حیثیت رکھتی ہے (2) اور

اس میں خاص توجہ دلانے والا جزء یہ ہے کہ یہ بچھونا کس نے قرار دیا۔ ظاہر ہے کہ اسی نے جس نے اس زمین کو خلق فرمایا۔ اسی طرح آسمان، وہ کوئی ٹھوس جسم ہے یا سیال مادہ ہے اسے قرآن کچھ نہیں بتاتا۔ بے شک اس کی محسوس شکل جو ہر آنکھ کے سامنے ہے وہ یہی کہ وہ ہمارے سروں پر ایک چھت کی طرح بلند ہے۔ بس اسی کو سامنے رکھ کر اس کے خالق کی جانب توجہ دلائی گئی ہے۔

اس کو سائنس اور ریاضی کے مسائل سے کوئی تعلق نہیں ہے۔ انکی حقیقتوں کو معلوم کرنے کے میدان میں فہم بشری کو تگ و دو کی پوری آزادی حاصل ہے۔ (3)

"السماء" کا لفظ جو پہلی دفعہ ہے وہ تو آسمان کے معنی میں ہے اور دوسری جگہ اس کی سمت یعنی اوپر کا رخ مقصود ہے۔ عربی میں بلندی کے رُخ کی ہر شے کو "سماء" کہتے ہیں۔ (4)

زمین اور آسمان کے تذکرہ کے بعد ان دونوں کے مابین جس نعمتِ الہی کا ظہور ہوتا ہے وہ باراں رحمت ہے۔ اس کا اثارنے والا بھی وہی اللہ ہے جس نے آسمان اور زمین پیدا کیے۔

جاهلیت والی عرب چاہے پرستش کتنے اصنام کی کرتے ہوں اور اللہ کو بالکل بھول گئے ہوں مگر تحت الشعوری طور پر یہ اُن سب کو احساس تھا کہ پیدا کرنے والا آسمان و زمین وغیرہ کا ان میں سے کوئی بھی نہیں ہے۔ خود قرآن مجید میں ہے :

"وَلَئِنْ سَأَلْتُهُمْ مِنْ خَلْقِ السَّمَاوَاتِ وَالْأَرْضِ لِيَقُولُنَّ اللَّهُ"

اور اگر ان سے پوچھو کہ آسمان اور زمین کو کس نے پیدا کیا تو وہ ضرور یہی کہیں گے کہ اللہ نے" (لقمان#38) دوسری جگہ ہے :

"وَلَئِنْ سَأَلْتُهُمْ مِنْ خَلْقِ السَّمَاوَاتِ وَالْأَرْضِ وَسَخْرَالشَّمْسِ وَالْقَمَرِ لِيَقُولُنَّ اللَّهُ" (العنکبوت#61)

اور اگر ان سے پوچھو کہ آسمان اور زمین کو کس نے پیدا کیا اور آفتاب و مہتاب کس کے قبضہ میں ہیں تو کہیں گے اللہ کے"

مگر عبادت کے محل پر وہ اللہ کے علاوہ دوسری چیزوں کے سامنے بھی جھکتے تھے اور اس وقت عملی طور پر یہ چیز بھول جاتے تھے کہ اصل جو ہے وہ اللہ ہے۔ یہ چیزیں کچھ بھی نہیں ہیں۔ قرآن نے اُن کے اسی تحت الشعوری احساس کو اُبھارتے ہوئے ان کو ان کے عمل کی غلطی کا احساس پیدا کر دیا ہے اور اسی لیے کہا گیا : "یہ جانتے ہوئے اب تو اللہ کے لیے ہمسر نہ تیار کرو"

غالباً دوسری قومیں جنہوں نے بے شمار دیوی دیوتا قرار دے لیے ہیں وہ بھی تحت الشعوری طبقاتِ نفس میں کسی ایک واحد ذات کو مانتی ہیں جو ان سب سے بالاتر ہے۔ اس کے بعد قرآن کی یہ آیت ان کے لیے بھی ایک لمحہ فکر پیدا کرنے کے لیے کافی ہے کہ اگر ایک ذات اس تمام کائنات کے لیے کافی ہے تو اس کے مقابل میں ان تمام دیویوں، دیوتاؤں کے ماننے کی کیا ضرورت ہے۔

\*\*

"وَإِنْ كُنْتُمْ فِي رَيْبٍ مِمَّا نَزَلْنَا عَلَى عَبْدِنَا فَاتُوا بِسُورَةٍ مِنْ مِثْلِهِ وَادْعُوا شَهَدَاءَكُمْ مِنْ دُونِ اللَّهِ إِنْ كُنْتُمْ صَدِيقِينَ" (23).

اور اگر تم اس کی طرف سے جوہم نے اپنے بندہ پراتارا شک میں مبتلا ہو تو اس قبیل کا ایک سورہ لے آؤ اور جو اللہ کو

چھوڑ کے حامی تمہارے ہیں انہیں بلا لو اگر تم سچے ہو"

پہلے جو کہا گیا تھا کہ اس کتاب میں کوئی شک نہیں اس کا یہ مطلب نہ تھا کہ اس میں کوئی شک کرنے والا نہیں بلکہ مقصود اس سے یہ تھا کہ اس کتاب کی اولہ حقانیت ایسے نمایاں ہیں جو شک کی گنجائش نہیں رکھتے اب اگر شک ہوگا تو ان دلائل سے بے توجہی کی بنا پر یا شک کا اظہار ہوگا تو بر بنائے عناد ان دلائل سے چشم پوشی کی بنا پر دونوں صورتوں میں بال مقابل اُن خصوصیات کی طرف ذہن کا متوجہ کرنا کافی ہے جس کا نتیجہ پہلی صورت میں ازالہ غفلت ہوگا اور دوسری صورت میں اتمام حجت۔

اس ذہن کے متوجہ کرنے کے لیے قرآن کریم نے یہ نفسیاتی طریقہ اختیار کیا کہ گرم سے گرم الفاظ اور تیز سے تیزتر انداز میں انہیں اس کا مثل لانے اور اس کے جواب میں دوسری کتاب تیار کرنے کی دعوت دی جائے۔ وہ غیور، باحمیت اور پرجوش عرب جو بات پر جان دینے تک کے لیے تیار ہو جاتے ہیں۔ ان طعنوں، سرزنشوں، ان مبارز طلبیوں کو سُنکر ضرور اپنی پوری غوروفکر کی طاقتون سے اس کا جواب تیار کرنے کی کوشش کریں گے اور یہ یقینی ہے کہ وہ ناکام اور عاجز رہیں گے۔ اس عاجزی کے بعد اگر وہ بے ہوش ہیں تو ہوش میں آئیں گے اور ضرور اُن خصوصیات کی طرف متوجہ ہونگے جو اس قرآن میں مافقہ البشر درجہ تک مضمر ہیں تب انہیں ایمان لانے کے سوا کوئی چارہ کار نہ ہوگا اور اگر وہ بر بنائے عناد انکار کرتے رہیں تب بھی کم از کم اس کے بعد انکی پیشانی پر عرقِ انفعال محسوس ہوگا اور اب زبان کھولنے کا موقع نہ رہے گا۔

یہ خاص بات ہے کہ اس عظیم اور پُرجلال تحدى کو رسول صلی اللہ علیہ والہ وسلم کی زبانی پیش نہیں کیا گیا تاکہ اس میں انانیت کا پہلو پیدا نہ ہو بلکہ اسے براہ راست خالق نے اپنی ذات و جلال کی شان کے ساتھ "هم" کے لفظ سے یاد کر کے یوں پیش کیا ہے کہ اگر تمہیں اس میں جو ہم نے اپنے "بندہ" پر نازل کیا ہے کوئی شک ہو۔ اس سے صاف ظاہر ہے کہ اس میں خود رسول صلی اللہ علیہ والہ وسلم کے ذاتی اقتدار اور ہنر آفرینی کو کوئی دخل نہیں ہے بلکہ رسول صلی اللہ علیہ والہ وسلم اس کے اظہار کا صرف ایک واسطہ ہیں اور کچھ نہیں۔ اور یہی درحقیقت وہ نقطہ شک ہے جس کے بال مقابل یہ دعوت دی گئی ہے یعنی مشرکین اسے خود رسول صلی اللہ علیہ والہ وسلم کا ذاتی کلام کہتے تھے۔ قرآن اسی کے بال مقابل میں جہاد کرنا چاہ رہا ہے اور انہیں متنبہ کرتا ہے کہ اگر رسول صلی اللہ علیہ والہ وسلم کا ذاتی کلام ہوتا تو کوئی وجہ نہیں کہ تم باوجود فصاحت و بلاغت میں انتہائی کمال رکھنے کے اس کا مثل نہ لا سکو۔

اب اگر موجودہ زمانے کے بعض تجدد پسند افراد اُسے خود رسول صلی اللہ علیہ والہ وسلم کی دماغی پیداوار قرار دیتے ہیں اور "من اللہ" ہونے کا مفہوم صرف یہ قرار دیتے ہیں کہ وہ خداداد طاقتون کا نتیجہ ہے تو یہ حقیقت میں اسی مقابل نقطہ کی صدائے بازگشت ہے جس کے خلاف اس آیت اور ایسی ہی متعدد آیتوں میں قرآن کریم نے ایک مستقل محاذ قائم کر رکھا ہے۔

مقابل والے کھلمن کھلا شک کیسا انکار کا اظہار کر رہے تھے۔ مگر چونکہ قرآنی آیات میں حقانیت و اعجاز کے ایسے نمایاں آثار موجود ہیں کہ یہ شک ہونا نہ چاہیئے اس لیے قرآن گویا اسے باور نہیں کرنا چاہتا کہ انہیں واقعی شک ہے۔ اس لیے کہا کہ "اگر واقعی تم کو شک ہے" یہ چونکانے کا پہلا تازیانہ ہے۔

"تو اس کے ایسے کلام میں سے (پوری کتاب نہ سہی) ایک سورہ ہی لے آؤ" یہ دوسرा تازیانہ ہے۔ اس میں یہ امر ہے کہ وہ پوری کتاب پیش کر دیں، اسے تو از اول ان کے حوصلہ اور ہمت ہی سے بلند قرار دیدیا گیا۔ اس کے بعد تو اگر انہیں ممکن ہوتا تو ضد ہو جاتی کہ اچھا تو سہی جو ہم پوری کتاب ہی لے آئیں۔ مگر قرآن نے تو بہت تخفیف کے ساتھ پیش کیا ہے کہ تم ایک سورہ ہی پیش کر دو۔ اس میں قید نہیں کہ طویل سورہ یا

مختصر.

یہ تیسرا تازیانہ ہے "اگر تم سچے ہو" سچے کس بات میں ! اسی میں کہ یہ اللہ کی طرف سے نازل شدہ نہیں ہے. اس سے انہیں نتیجہ کی طرف توجہ دلائی گئی ہے کہ اگر تم اجتماعی طاقت سے بھی ایسا نہ کرسکو تو تمہیں سمجھنا چاہیئے کہ تمہارا خیال غلط ہے. یہ حقیقتہ کسی انسانی طاقت کا نتیجہ ہے ہی نہیں بلکہ یہ بذاتِ خاص اللہ کا نازل کردہ ہے اور اسی کا کلام ہے. کسی آدمی کا کلام نہیں ہے.

مولوی عبدالماجد صاحب دریابادی اس ذیل میں رقم طراز ہیں "قرآن مجید اپنی فصاحت اور حسنِ انساء کے لحاظ سے بھی یقیناً بے نظیر ہے. جیسا کہ عرب کے بڑے بڑے ماہرین ادب تسلیم کر چکے ہیں لیکن یہاں جو تحدی کی جا رہی ہے اس کا مخاطب "یا ایها الناس" کے ماتحت سارا عالم ہے صرف قریش یا اہل عرب نہیں. اس لیے قرآن مجید کو یہاں صرف انشاء و فصاحت تک محدود رکھنا اس کے عام و عالمگیر چیلنچ کو محدود کر دینا ہے.

قرآن نے اپنی حقیقت خود یہ بیان کر دی ہے کہ وہ "هدی للمرتقین" کتابِ هدی ہے. یعنی انفرادی و اجتماعی دونوں زندگیوں کا جامع نظام ، مکمل ، ہمہ گیر و ہرجہتی دستورالعمل. اس کے علاوہ اس کی اور جتنی حیثیتیں ہیں تبعی و ضمنی ہیں. وہ یہاں پیش اپنے سب سے بڑے وصف کو کر رہا ہے اور پکار کے کہہ رہا ہے کہ جو ہدایتیں اور بصیرتیں میرے ایک سورہ کے اندر موجود ہیں اب اگر تم اپنی متحده کوشش اور جدوجہد سے بھی اس کے مقابلہ میں کوئی چیز پیش کر سکتے ہو تو لاو دکھاؤ.

"من مثله" میں مثلیت کی تفسیر پر بہترین روشنی خود قرآن مجید ہی سے پڑتی ہے.

"قل فأتوا بكتاب من عند الله هو أهدى من هم ماتبعه ان كنتم صادقين" (القصص#49)

اہدی کے ایجاز میں سب کچھ آگیا.

یہ امر کہ قرآن مجید بحیثیت فصاحت و بلاغت ہی نہیں بلکہ اور دیگر حیثیتوں سے بھی معجزہ ہے. علامہ بلاعی (رح) کی عربی تفسیر "آلاء الرحمن" کے مقدمہ اور پھر اردو میں ہمارے "مقدمہ تفسیر" میں کافی بسط و تفصیل کے ساتھ بیان کیا گیا ہے لیکن یہ امر کہ اس آیت میں مخاطب "یا ایها الناس" کے ماتحت سارا عالم ہے. اس صورت میں پایہ ثبوت کو پہنچ سکتا ہے کہ جب موجودہ نظم قرآنی ہی کی مطابقت سے یہ مان لیا جائے کہ یہ آیت تنزیل میں بھی گزشتہ آیات سے مرتب ہے.

دوسری صورت میں جبکہ اس کا مخاطب براہ راست قومِ عرب اور بالخصوص قریش کو مانا جائے تو پھر دوسرے افراد کے مقابلہ میں عنوانِ استدلال دوسرا ہو جائیگا. یعنی قوم عرب اور قریش کی اس کے اس تحدی اور دعوت مقابلہ کے سامنے سپرانداختگی خود تمام عالم سے اس کی حقانیت تسلیم کرانے کے لیے حجت ہوگی. اس لیے چاہئے چیلنچ کا رخ ایک محدود سمت کے ساتھ مخصوص ہو مگر نتیجہ اس کا تمام عالم کے لیے مشترک حیثیت رکھتا ہے اور وہ کسی جماعت میں محدود نہیں ہے.

\*\*

"فَإِنْ لَمْ تَفْعُلُوا لَنْ تَفْعَلُوا فَاتَّقُوا النَّارَ الَّتِي وَ قُوْدُهَا النَّاسُ وَ الْحِجَارَةُ ۚ ۸ أَعِدْتُ لِلْكَافِرِينَ(24)

اب اگر تم نے ایسا نہ کیا اور ہرگز نہ کرو گے تو پھر بچنے کا سامان کرو اس آگ سے جس کا لیندہن آدمی اور پتہر ہیں اور وہ کافروں کے لیے مہیا ہے"

\*\*\*

یہ گزشتہ تازیانوں کے بعد ایک نہیں بلکہ ایک ساتھ متعدد تازیانے ہیں جنکی چوٹ سے اگر ذرہ برابر بھی امکان

ہوتا تو وہ ببلہ کر بغیر جواب لائے ہوئے قرار نہ لیتے۔

سچائی پر اعتماد تو دیکھئے کہ ایسے مخالف ماحول میں دشمنوں کی اس کثرت کے درمیان داعی حق حتم و جزم ، سکون و اطمینان بلکہ یقین کے ساتھ کہہ رہا ہے "تم ہرگز ہرگز اس کا مثل نہیں لاؤگے" ذمہ دار انسان کے لیے اتنے حتم و جزم اور یقین کے ساتھ اپنے مستقبل کے کسی فعل کے اعلان میں دشواری ہوتی ہے چہ جائیکہ دوسرے کا عمل اور وہ بھی مخاطب جماعت کا۔

یہ اعلان خود اس کا سب سے بڑا محرك ہو سکتا ہے کہ وہ اب اپنی پوری طاقت صرف کرکے اسے غلط ثابت کرنے کی کوشش کریں۔ اب اگر ایسا نہ ہوا اور قرآن کی سچائی پورے طور پر ثابت ہوئی تو ہر کھلے ہوئے دل سے غور کرنے والے کو ماننا پڑے گا کہ قرآن کا مثل لانا یقیناً طاقت بشری سے باہر تھا۔

بقول عبدالماجد صاحب "قرآن کے چیلنج کو سازھے تیرہ سو سال سے اوپر ہی ہو چکے ہیں اور دنیا کے کتب خانے اس کتاب سازی کے عہد میں، قرآن کے برابر کیا معنی تقریباً برابر کتاب سے بھی یکسر خالی ہیں "ہرگز نہیں کروگے" یعنی قیامت تک ، اللہ اکبر! کس زور کی تحدی ہے اور وہ بھی ایک "امی" کی زبان سے! اپنی عقل و حکمت، اپنے علوم و فنون پر ناز رکھنے والوں کو کیسا جوش اس وقت آیا ہوگا اور آج بھی آرہا ہے لیکن خدا کی بات جہاں تھی وہیں رہی۔

"اگر ایسا نہ کیا اور ہرگز نہ کروگے" یعنی اگر تم مثل اس کا نہ لائے اور ہرگز نہ لاسکو گے اس کی جزا یعنی اس "اگر" کا نتیجہ درحقیقت یہ ہے کہ "پھر ایمان لے آؤ ، تسلیم کرلو کہ یہ بے شک اللہ کا کلام ہے اور محمد مصطفیٰ صلی اللہ علیہ والہ وسلم اس کے رسول ہیں۔ لیکن اس کے بعد بھی اگر تم نے نہ مانا اور اپنے عناد پر اصرار قائم رکھا تو پھر اس کا نتیجہ وہ آخرت کا عذاب ہے جسے "آتشِ جہنم" کہتے ہیں ، کیونکہ وہ کافرین یعنی جان بوجہ کر انکار کرنے والوں" ہی کے لیے مہیا ہے۔ اس دعوتِ ایمان کو جو تمامیتِ حجت کا لازمی نتیجہ ہونا چاہیئے اور پھر اس دعوت کو قبول نہ کرکے کفر پر قائم رہنے کی پاداش ، ان دونوں کو انتہائی اختصار کے ساتھ "فَاتَّقُوا النَّارَ الَّتِي الْخَ" کے الفاظ میں کہہ دیا گیا ہے۔ یعنی اب اس حجت کے قائم ہو جانے کے بعد انکار کا نتیجہ اس قسم کی آگ ہے جس کے بصورتِ بقائی انکار تم یقینی مستحق قرار پاؤ گے اس سے بچاؤ کا سامان صرف یہ ہے کہ کھلے دل سے حقیقت جا اعتراف کرلو اور کفر سے ہٹ کر ایمان کا راستہ اختیار کرلو۔

آتشِ جہنم کا عذاب تو درحقیقت نافرمان آدمیوں کے لیے ہے مگر ان آدمیوں ہی کے لیے اس سے بڑھ کر توهین یا سزا کیا ہوگی کہ اُن کے وہ معبد بھی جنکی وہ پرستش کرتے تھے اسی آگ میں جہونک دیئے جائیں۔ یہ ان پتھروں کو سزا دینا نہیں ہے بلکہ ان آدمیوں ہی کے عذاب کی تکمیل ہے۔ اس اعتبار سے کہا گیا ہے کہ اس آگ کا ایندھن یہ آدمی بھی ہیں اور وہ پتھر بھی جو اُن کے معبد تھے۔<sup>(5)</sup> اور پھر چونکہ وہ انہیں تصور کرتے تھے کہ یہ اللہ کے یہاں ہماری سفارش کریں گے تو آج انہیں بھی انہی کے ساتھ جہونک کر دکھادیا گیا کہ یہ سفارش کیا کریں گے ، یہ اللہ کے مقابلہ میں بے بس ہیں۔<sup>(6)</sup>

"اعدت" یعنی مہیا کی گئی ہے، کے لفظ سے ظاهر ہے کہ دوزخ خلق ہو چکا ہے اور موجود ہے مگر پرده غیب میں ہے جس پر "ایمان بالغیب" کا شعار رکھنے والوں کو کسی قسم کے شک و تردد کا محل نہیں ہے۔

وَبَشِّرِ الَّذِينَ أَمْنَوْا وَعَمِلُوا الصَّلِحَاتِ أَنَّ لَهُمْ جَنَّتٍ تَجْرِي مِنْ تَحْتِهَا الْأَنْهَارُ كَلَمَارْزِقُوا مِنْهَا مِنْ ثَمَرَةً رِزْقًا قَالُوا هَذَا الَّذِي رُرِقْنَا مِنْ قَبْلٍ وَأُتُوا بِهَا مُتَشَابِهًـا وَلَهُمْ فِيهَا آرَوَجٌ مُطَهَّرٌ وَهُمْ فِيهَا خَالِدُونَ (25)

اور مژده دو ان کو جو ایمان لائے اور جنہوں نے اچھے کام کیے کہ ان کے لیے بہشت کے گھنے باغ ہیں جن کے نیچے نہریں جاری ہیں۔ جب بھی انہیں ان میں سے کوئی پہل کہانے کو ملیگا تو وہ کہیں گے کہ یہ تو وہی ہے جو پہلے ہمیں کہانے کو مل چکا ہے حالانکہ انہیں وہ ملتا جلتا ہوا دیا گیا ہے اور ان کے لیے ان بہشتوں میں پاک بیویاں ہون گی اور وہ ان میں ہمیشہ ہمیشہ رہیں گے

؛؛

"بشر" (مژده دو) کا مخاطب رسول صلی اللہ علیہ وسلم ہی ہے اور مخاطب غیر معین کی حیثیت سے یہ مقصود بھی ہو سکتا ہے کہ یہ لوگ اس خوشخبری کے قابل ہیں۔ لہذا کوئی بھی ہو اسے حق ہے کہ وہ انہیں یہ مژده پہنچادے۔

قرآن کریم میں اکثر مقامات جہاں اس قسم کا مفرد تخاطب ہے جیسے :

"أَرِيتَ الَّذِي يَكْذِبُ بِالدِّينِ"

"الْمَ تَرْ كَيْفَ"

وغیرہ ان میں یہ دونوں احتمال ہیں مگر میرے نزدیک ان میں سے اکثر مقاماتِ ترجیح دوسرے ہی پہلو کو ہے جیسے آجکل کے طرزِ تحریر میں "ذرا دیکھو تو" یا "ملاحظہ کیجئے" کہا جاتا ہے اور اس سے مقصود کوئی خاص شخص نہیں ہوتا۔

مژده کے مستحق کون ہیں؟ وہ جو ایمان لائیں اور اچھے عمل کریں، یہ یاد رکھنے کے قابل بات ہے کہ قرآنِ کریم میں کسی ایک جگہ بھی جنت اور نعیم آخرت کی بشارت صرف ایمان پر مرتب نہیں کی گئی ہے بلکہ ہر جگہ ایمان کے ساتھ ساتھ اعمالِ صالحہ کا ذکر ضروری سمجھا ہے۔ اس کے بعد کاش انکی آنکھیں کھلیں جو صرف "جماعتِ مومنین" کا لقب اختیار کر کے اپنے کو اعمالِ صالحہ سے بنیاز سمجھ لیتے ہیں اور "مومن" ہونے کے بعد

"حقوق اللہ" اور "حقوق العباد" کی پابندی کے بغیر ہی نعماتِ بہشت کے خوابِ خوشگوار میں مست ہیں۔ اسی طرح یہ بھی حقیقت ہے کہ صرف اعمال کی پابندی کرنا اور اصول عقائد کی خبر نہ رکھنا بھی نجات کے لیے ہرگز کافی نہیں ہے۔

مولوی عبدالماجد صاحب نے بالکل درست لکھا ہے: "نیک عمل کے سمجھنے میں بہتوں کو دھوکا ہوا ہے اور یہ مغالطہ آجکل بہت عام ہو گیا ہے۔ سمجھا یہ جانے لگا ہے کہ نیکی اور ایمان ایک دوسرے سے بالکل الگ اور بے تعلق چیزیں ہیں اور پھر اس مفروض کی ایک فرع یہ قائم کی گئی ہے کہ کوئی شخص ممکن ہے کہ بہت صالح اعمال کا ہو لیکن ایمان سے یک لخت محروم ہے۔ حالانکہ یہ تخیل ہی سرتاسر غلط ہے۔ نیکی ایمان سے الگ نہیں۔ ایمان ہی کی عملی شکل کا نام ہے۔ ایمان جب تک قلبی ہے ایمان ہے۔ اگر قولی و لسانی ہے تو اسلام ہے اور وہی ایمان جب عمل سے ظاہر ہونے لگتا ہے تو اس کا نام حسنِ عمل، حسنِ کردار یا عمل صالح پڑھاتا ہے اور حسنِ عمل کے معنی ہی یہی ہیں کہ وہ عمل رضائیِ الہی کے مطابق ہو، کوئی نیکی اگر پیش کی جاتی ہے جس کی تھے میں جذبہ ایمانی خفیف سا بھی موجود نہیں تو وہ نیکی نہیں نیکی کی صورت ہے، نیکی کی نقل ہے۔ اور جس طرح نماز کی نقلِ محض نماز نہیں، اسی طرح کسی نیکی کی نقل پر اطلاق نیکی کا نہیں ہو سکتا۔ عمل نیک کی تو تعریف ہی یہ ہے کہ وہ عمل ضابطہ شریعت کے مطابق ہو"

اس میں صرف یہ جزو قابل ترمیم ہے کہ "ایمان قولی و لسانی ہو تو اسلام ہے" ایسا ہی نہیں بلکہ عملی بھی باین معنی کہ اعمال صالحہ کے مطابق شریعتِ اسلام ظاہری طور پر پابندی ہے مگر اصولِ اعتقاد قلبی طور پر

مستحکم نہیں ہیں تو وہ بھی اسلام ہی ہوگا۔

اس کے ساتھ یہ بھی قابل لحاظ ہے کہ جب خوشخبری ، نوید اور مژده جہاں بھی ہے اس میں جس طرح ایمان تنہا نہیں ہے اسی طرح "عمل صالح" بھی۔ تو اب اس بحث کی اہمیت ہی نہیں رہتی کہ بغیر ایمان عمل صالح ہوسکتا ہے یا نہیں ، جبکہ قرآن کریم نے عمل صالح کو ایمان کے ساتھ مشروط کیا ہے تو بغیر ایمان تنہا اعمال صالح ہوں بھی تو نجات کا استحقاق سمجھنا قرآن کریم کی رو سے غلط ہی قرار پائیگا۔

اس کے ساتھ ساتھ ایمان اور اعمال صالح میں ایک فرق بھی قرآن کریم سے ثابت ہے اور وہ یہ کہ استحقاق اور وعدہ جنت میں ہیں تو دونوں ضروری، لیکن اگر ایمان ہے اور اعمال صالح میں کمزوری ہے تو بطور "عفو و کرم" مغفرت کا امکان ہے لیکن اگر ایمان ہی نہیں ہے تو پھر مغفرت کا کوئی سوال ہی پیدا نہیں ہوتا جیسا کہ قرآن کریم میں ہے :

"ان الله لا يغفر ان يشرك به و يغفر مادون ذلك لمن يشاء"

یقیناً اللہ اسے کبھی نہیں بخشتا کہ اس کے ساتھ شرک کیا جائے اور اس کے علاوہ جو گناہ ہو اسے جس کے لیے چاہتا ہے بخش دیتا ہے"

آخری لفظ "لمن يشاء" سے ظاہر ہے کہ یہ مغفرت بطور وجوب اور بحیثیت عموم نہیں ہے بلکہ بطور امکان اور بطور ایجاد جائز ہے۔ لہذا اس کے بال مقابل حکم جو نفی ایمان کی صورت میں "لایغفر" کے لفظ سے دیا گیا ہے وہ بطور امتناع اور بطور سلب کلی ہوگا اور اس کے بعد ان دونوں کی مقابل جماعت یعنی ایمان اور عمل صالح دونوں درجنوں پر فائز افراد کے لیے جو مژدہ نجات اور نعیم جنت کا ہے وہ بطور وجوب اور بطور ایجاد کلی ہے جس میں کسی استثنائی گنجائش نہیں ہے اور یہی وہ ہے جس کا عقلی طور پر عدل الہی بھی متناقض ہے۔ باع کا یہ وصف کہ اس کے نیچے سے نہیں جاری ہیں اس لحاظ سے لایا گیا ہے کہ باع اصل میں زمین نہیں بلکہ درختوں کا نام ہوتا ہے، اس لیے نہیں اگرچہ زمین کے اوپر ہیں مگر باگوں کے لحاظ سے انہیں نیچے ہی کہنا درست ہے۔(7)

جب بھی انہیں کہانے کو ملے گا وہ کہیں گے کہ یہ تو وہی ہے جو ہم دنیا میں کہا چکے ہیں" اس سے ظاہر ہوتا ہے کہ آخرت کے پہل جنس کے اعتبار سے وہی ہونگے جو دنیا میں ہوا کرتے ہیں اور "جب بھی" کے الفاظ جو بطور کلیہ ہیں ان سے ظاہر ہوتا ہے کہ آخرت کے میوہ محدود اُن ہی اقسام میں نہیں ہیں جن کا ذکر قرآن کریم میں ہے اس لیے کہ عرب اُن سے واقف تھے۔ کیونکہ اہل جنت کا دائِرہ کسی خاص قوم و ملک والوں سے مخصوص نہیں ہے بلکہ ہر ملک کے ایمان و عمل صالح اختیار کرنے والے اس "مژدہ" کے عموم میں برابر کا حصہ رکھتے ہیں اور ظاہر ہے کہ پہل ہر ملک کے مختلف ہوتے ہیں۔ بہت ممکن ہے کہ وہ میوہ جن کا ذکر قرآن میں نام کے ساتھ ہے بعض ممالک میں پیدا ہی نہ ہوتے ہوں لیکن قرآن اُن میں سے ہر شخص کا ہر ایک میوہ کے ملنے کے وقت یہ قول بیان کر رہا ہے کہ یہ وہی ہے جو دنیا میں ہمیں ملا تھا۔ اس سے ظاہر ہوتا ہے کہ ہر ایک کو وہی پہل ملیں گے جنہیں وہ دنیا میں شوق سے کھاتا رہا ہے۔ جب ہی تو وہ یہ کہے گا کہ ارٹ یہ تو وہی ہے جو دنیا میں ہم کہا چکے ہیں。(8)

قرآن کریم نے انکے اس قول کو حق بجانب بھی قرار دیا ہے اور واقعہ کے اعتبار سے کسی حد تک غلط بھی۔ یعنی انکا یہ کہنا اس لیے حق بجانب ہے کہ شکل و صورت اور شمائیں میں وہ اس دنیا ہی کے پہلوں کی طرح ہیں لہذ اُنہیں یہ کہنا چاہیئے کہ یہ وہی ہیں مگر واقعہ یہ ہے کہ اُن پہلوں سے حقیقت کے لحاظ سے بالکل

مختلف ہیں۔ یہ دونوں باتیں ایک ہی ساتھ ایک لفظ "متشابها" سے ظاہر کی گئی ہیں کیونکہ مشابہت ہمیشہ دو ایسی ہی چیزوں میں ہوتی ہے جو ذاتاً مغایرت رکھتی ہوں لیکن کسی صفت یا صورت میں ملتی جلتی ہوں۔

آخر میں اہل جنت کے لیے "ازواج مطهرة" کا ذکر کیا گیا ہے۔ اس میں حوریں بھی آسکتی ہیں اور جن نیک شوہروں کی دنیا والی نیک بیویاں اس لائق ہوں کہ وہ بہشت میں اپنے شوہروں کے ساتھ رکھی جائیں وہ بھی داخل ہوسکتی ہیں۔

"مطهرة" کے لفظ میں ان جسمانی حدث و خبث والی کثافتوں سے پاکیزگی بھی داخل ہے جو جنت کے لیے موزوں نہیں ہیں اور اخلاقی برائیوں سے بھی۔

جبکہ ازواج حوروں کے قبیل سے ہوں تو اس وصف سے متصف ہونا ظاہر ہے اور دنیاوی بیویاں بہشت میں داخل ہونے کے بعد اُن کے طبائع جسمانی و روحانی میں بھی وہ اعتدال پیدا ہوگا کہ جسمانی و روحانی کثافتیں جو دنیا کی مادی آب و ہوا کے لوازم میں سے ہیں وہاں باقی نہ رہیں گی اور اس لیے وہاں وہ "ازواج مطهرة" کے لقب کی مستحق قرار پا سکیں گی۔ (9)

آخری صفت یہ بیان کی گئی ہے کہ اہل جنت ان نعمات میں ہمیشہ ہمیشہ رہیں گے۔ یہ وہ خصوصیت ہے جو نعیمِ جنت میں دنیا کی ہر لذت و راحت سے ایک ایسا امتیاز پیدا کرتی ہے کہ وہاں (جنت) کی کوئی ایک چھوٹی سے چھوٹی نعمت دنیا کی تمام نعمتوں کے مجموعہ سے زیادہ بیش قیمت قرار پاجاتی ہے کیونکہ دنیا کی ہر نعمت چاہئے کتنی ہی لذیذ کیوں نہ ہو بہرحال فانی ہے اور آخرت کی ہر ہر نعمت ہمیشہ کے لیے باقی ہے اور اسی مفادِ آخرت کے مقابلہ میں دنیا کا بڑھ سے بڑھ مفاد بھی نظرانداز کیے جانے کے قابل ہے جس کا نتیجہ یہ ہے کہ ایک مسلمان کو مرضیِ خالق کے مقابلہ میں نہ کسی لالج میں مبتلا ہونا چاہئے اور نہ کبھی کسی خوف سے متاثر ہونا۔

\*\*

-----  
(1) چندھیا دھ (تاج العلماء)

(2) یکفى فی النعمته علیناں یکون فی الارض بسائط وصواضع صفر وشة ومسطوقه ولیس یحب ان یکون جمیعها کذالک (مجموع البیان)

فسواء كذلك او على شكل الكرة فالافراش غير فستنکر ولا مدفوع لعظم جرمها وتباعدا طراف (نيشاپوري)

(3) ولیس فی ذلك صراحة بموافقة الهيئة القديمة ولا صراحة بمخالفة الهيئة الجديدة (بلاغي)

(4) كل شيء كان فوق شيء آخر فهو لما تحته سماء (طبرى)

(5) الظاهر ان كون الناس والحجارة وقود النار اي حطبها يريد به اصنامهم المنحوتة الحجارة كفرله تعالى انكم وما تعبدون من دون الله حصب جهنم. (مجموع البیان)

(6) لما اعتقد الكفار في حجارتهم المعبدة من دون الله انها الشفعاء. (رازي)

(7). اراد الخبر عن ماء انہارها بانہاجاریة تحت الاشجار لان الماء اذا كانت تحت الارض فلاحظه فيها للعيون (مجموع البیان)

(8). معناه هذا الذي رزقنا من قبل في الدنيا عن ابن عباس وابن مسعود(رضوان الله عليهما) قال الشيخ ابو جعفر واقوى الاقوال قول ابن عباس(رض) (مجموع البیان)

(9). قيل هن الحور العين وقيل هن من نساء الدنيا قال الحسن هن عجائزكم الغمض الرمض الغمش طهرن من قدرات الدنيا.